Globethics Repository

Iman bi al-Qadr

This page was generated automatically upon download from the Globethics Repository. More information on Globethics see https://www.globethics.net. Data and content policy of Globethics Repository see https://repository.globethics.net/pages/policy.

Item Type	Book
Authors	Al-Qodiri, Muhammad Thohir
Publisher	Manshurat Minhaj al-Quran
Rights	With permission of the license/copyright holder
Download date	2026-07-17 05:56:52
Link to Item	http://hdl.handle.net/20.500.12424/188460

ایمان بالقدر

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اِیمان بالقدر

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلی کیشنز
365- ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 35168514، 042-111-140-140
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 37237695
www.Minhaj.org-sales@Minhaj.org

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	ایمان بالقدر
خطبات	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	ضیاء نیّر
تخریج و پروف ریڈنگ	:	محمد خلیق عامر
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	جنوری 1989ء (2,000)
اِشاعتِ دوم	:	ستمبر 1995ء (2,000)
اِشاعتِ سوم	:	نومبر 1997ء (2,000)
اِشاعتِ چہارُم	:	اگست 2011ء
تعداد	:	1,200
قیمت	:	-/75 روپے

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز کی کیسٹس اور CDs و DVDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے تحریکِ منہاجُ القرآن کے لیے وقف ہے۔
(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

fmri@research.com.pk

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَ بَارَكَ وَسَلَّمَ

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۴-۱ / ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل وایم ۴ / ۷۰-۹-۳۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔ا / اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت / اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱ / ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرس

عنوانات	صفحہ
❁ پیش لفظ	۹
باب اوّل	
اِیمان بالقدر	۱۱
۱۔ خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق	۱۴
کیا مخلوق ہونے کے لئے دکھائی دینا ضروری ہے؟	۱۸
جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	۱۹
ایک غلط فہمی اور اس کا جواب	۲۲
۲۔ انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	۲۳
بین القدر والجبر کا مفہوم	۲۵
(۱) فرض اور خواہش میں کشمکش کا مرحلہ	۲۵
(۲) غور و خوض کا مرحلہ	۲۶

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

صفحہ	عنوانات
۲۶	(۳) انتخابِ نیت کا مرحلہ
۲۶	(۴) عزم و ارادے کا مرحلہ
۲۷	(۵) تعمیل کا مرحلہ
۲۷	(۶) نتیجۂ عمل کا مرحلہ
	باب دُوُم
۳۳	جبر و قدر اور تصوّرِ عدل
۳۶	۱۔ اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل
۳۸	(۱) عدل کا مقام رفیع ...... اِحسان
۴۰	(۲) اللہ تعالیٰ کی اِحسان پسندی
۴۱	(۳) اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا
۴۲	۲۔ جزا و سزا اور نظامِ عدل
۴۳	(۱) جزا و سزا اور اِتمام حجت
۴۶	(۲) اِتمامِ حجت کا مفہوم
۴۷	۳۔ اَخلاقی جدوجہد
۵۰	۴۔ حالت اِضطرار اور قانون اسلامی

عنوانات	صفحہ
(۱) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان	۵۳
(۲) سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ	۵۳
(۳) ایک صحابی کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب	۵۵
باب سوم	
قضا و قدر کا اِنسانی زندگی میں کردار	۵۷
۱۔ قدر کا مفہوم	۵۹
عوام الناس کی غلط فہمی کا ازالہ	۶۱
۲۔ قضا و قدر کی دو اِصطلاحیں اور ان کا مفہوم	۶۲
(۱) قضا و قدر آفاقی و کائناتی اِعتبار سے	۶۲
(۲) اِنسانی زندگی میں قدر کا مفہوم	۶۳
قضا کا مفہوم	۶۵
حق کی پکار جاری رہتی ہے	۶۷
قدر مقدم ...... قضا مؤخر	۶۸
موسمی حالات کی پیشین گوئی	۶۹
پیشین گوئیوں کا پس منظر	۷۰
قضا معلق اور قضا مبرم	۷۳
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان	۷۴

صفحہ	عنوانات
۷۵	سرورِ کائنات ﷺ کا اِرشاد گرامی
۷۹	مآخذ و مراجع

پیش لفظ

تقدیر کا مسئلہ اُن بنیادی عقائد سے ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ مسئلہ تقدیر نازک اُمورِ شریعہ میں سے ہے۔ اِس کے بارے میں زیادہ سوال و جواب کرنے اور کریدنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اِنسان کے اَفعال کا خالق ہے مگر اُس نے بندوں کو اپنے اَفعال کی بجا آوری کے معاملے میں خود مختار بنایا ہے یعنی اَفعال کا کاسب (سرانجام دینے والا) اِنسان خود ہے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اَحکامِ شریعت اور اَمر و نہی کا ثبوت بھی اِختیار سے ہی ہے اور اگر اِنسان کو اِختیار ہی نہ ہو تو اَمر و نہی اور جزا و سزا کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اِنسان مجبورِ محض ہے نہ مختارِ کُل۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدّ ظلّہ العالی کی زیرِ نظر کتاب آپ کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ ہے۔ آپ نے اِنتہائی سادہ پیرائے میں قضاء و قدر جیسے گنجلک مسئلہ کی صراحت فرماتے ہوئے اِنسان کا اِختیار و اِختبار بھی ثابت کیا ہے اور خالق حقیقی کا مختارِ کل ہونا بھی واضح کیا ہے۔ بلا شبہ یہ کتاب موضوعِ زیرِ بحث پر ایک اَہم تالیف کا درجہ رکھتی ہے اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لیے حصہ وافر کا اِہتمام کرے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اُمورِ شریعہ کا فہم عطا فرمائے۔ (آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ)

(محمد فاروق رانا)

ڈپٹی ڈائریکٹر رِیسرچ

باب اَوّل

فلسفۂ قدر

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع 'ایمان بالقدر' ہے جو اَرکانِ ایمان میں سے آخری مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اَوہام و وساوس پائے جاتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بس یہاں رُک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خواہ مخواہ اُلجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہوسکتا ہے۔

قدر کا لغوی مفہوم کچھ یوں ہے:

القَدَرُ: الاسم، القَدْرُ المصدر. وهو ما يُقَدِّره الله ﷻ من القضاء، ويحكم به من الأمور. (۱)

''لفظ قدر اِسم ہے، اور قدر مصدر ہے اور اس سے مراد وہ قضا (فیصلہ) جسے اللہ تعالیٰ مقدر کردے (کہ وہ ہوکر رہے گا) اور اُمور میں سے جس چیز کا اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادے (وہ قدر ہے)۔''

جب کہ قدر کا اِصطلاحی معنی یہ ہے:

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۵:۷۴

أن القدر سِرٌّ من سِرّ الله، بل الإيمان بما جرت به المقادير من خير أو شرّ، واجب على العباد أن يؤمنوا به، ثم لا يأمن العبد أن يبحث عن القدر فيكذب بمقادير الله الجارية على العباد، فيضلّ عن طريق الحق. (۱)

''قدر، اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے، بلکہ خیر و شر کی جو تقدیریں جاری ہوتی ہیں ان پر ایمان لانا بندوں پر واجب ہے، پھر ایسا ممکن نہیں کہ بندہ قدر کے بارے میں بحث کرے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ان قدروں کے بارے میں جو بندوں پر جاری ہوتی ہیں جھوٹ سے مامون رہے، پس پھر راہِ حق سے گمراہ ہو جائے۔''

اِسی مسئلے کا نام 'مسئلہ تقدیر' یا 'مسئلہ قضا و قدر' ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ 'انسان کے مجبور یا مختار' ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی موضوع بحث نہیں رہا بلکہ یہ دُنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات (philosophy)، جرمیات (criminology)، عمرانیات (sociology) اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلہ پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں، جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے علم اور فکر سے فروغ بخشا۔ پھر یہ زبان، ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہی۔ اس بنا پر اس مسئلے میں مختلف قسم کی آراء ملتی ہیں۔ اسی لئے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

۱۔ خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن حکیم تقدیر کے جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے،

(۱) آجری، کتاب الشریعة، ۲:۱۹۸

اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ○ (۱)

’’حالانکہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے (سارے) کاموں کوخَلق فرمایا ہے ○‘‘

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں۔ کسب کے معنیٰ کرنے یا کمانے کے ہیں، جب کہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے مگر انسان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اُس کی تمام تر اشیاء و اعمال مخلوقِ محض ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ دُنیا کی ہر چیز کا خالق و باری ہے۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں، اوّل اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصور اور دوم انسان اور اُس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اُس کی ذات و صفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لئے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں۔ جن کی من حیث المخلوق تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب و ارتکاب، انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لئے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال سے کیا نسبت ہو گی، قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

(۱) الصّٰفّٰت، ۳۷: ۹۶

النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o(۱)

''ہاں واقعی جس نے برائی اختیار کی اور اس کے گناہوں نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیںo''

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (۲)

''اس نے جو نیکی کمائی اس کے لئے اس کا اجر ہے اور اس نے جو گناہ کمایا اس پر اس کا عذاب ہے۔''

اسی طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے یا ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطۂ سمندر ہے یا خشکی، جمادات میں سے ہے یا حیوانات میں سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصور، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق۔ ہر چیز اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلاقیت وصناعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے۔ اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے، مثلاً گفتگو کرنا، آرام کرنا، کھیلنا کودنا، حوائجِ ضروریہ کی تکمیل کرنا، اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، آنا جانا۔ الغرض اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیوں کہ فعل بھی انسان ہی کی طرح اَنفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ فعل کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہوگی جیسے کہ گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی سورۃ الصافات کی آیت نمبر ۹۶ کے الفاظ وَمَا تَعْمَلُوْنَ میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے مگر اس کے پہلو دو ہیں۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور دوسرے کے اعتبار سے انسان

(۱) البقرة، ۲: ۸۱
(۲) البقرة، ۲: ۲۸۶

کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لئے بچے کی تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے، ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش کے لئے 'امرِ ایزدی' کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل 'رشتہ ازدواج' کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسباً تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا لیکن خلقاً یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا مرہونِ منت ہے۔

اسی لئے قرآن کریم میں ایسے 'جوڑوں' کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○(۱)

''پھر جب اس نے انہیں تندرست بچہ عطا فرما دیا تو دونوں اس (بچے) میں جو انہیں عطا فرمایا تھا اس کے لئے شریک ٹھہرانے لگے تو اللہ ان کے شریک بنانے سے بلند و برتر ہے ○''

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتاً اللہ ربّ العزت کا فعل ہے۔ اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم 'کُن' کا دست نگر ہے۔

(۱) الأعراف، ۷:۱۹۰

(۱) کیا مخلوق ہونے کے لئے دکھائی دینا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے، اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لئے الگ طور پر قابل دید ہونا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق بحیثیت مخلوق، ہر ایک کے لئے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے قسم کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَo وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَo(۱)

''سو میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہوo اور ان چیزوں کی (بھی) جنہیں تم نہیں دیکھتےo''

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دُنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آسکتیں، مثلاً ہوا ہر جگہ موجود ہے مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے کان بند کر لئے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے جب کہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کی محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حِس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسیّ ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جا سکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے، اس لئے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے مگر اس کا عمل بذات خود ایک لطیف وجود ہے۔ لہٰذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء بھی ہم

(۱) الحاقة، ۶۹: ۳۸- ۳۹

دیکھ سکتے ہیں، مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہٖ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحمت اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دیتا۔ یعنی اُنہیں دیکھنے کے لئے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں لیکن ان کے ظہور کے لئے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لئے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لئے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح عمل کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے، اس کے بغیر نہیں۔ لہٰذا عامل کو عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصور کیا جائے گا کیوں کہ اس نے عمل کو فی نفسہٖ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

(۲) جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوق خدا ہے لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے اس لئے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیوں کہ جزا و سزا کا تعلق کسب اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۂ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا.(۱)

---

(۱) الملك، ۶۷:۲

''جس نے موت اور زندگی کو (اِس لیے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔''

موت وحیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا مرہونِ منت ہے۔ اسی طرح اعمال بھی تخلیق کے اعتبار سے مخلوق باری تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا وجود میں آنا انسان کا مرہونِ منت ہے۔ زندگی اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالم آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دُنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون بُرے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ.(۱)

''اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو اُس (بداعمالی) کے سبب سے ہی (پہنچتی ہے) جو تمہارے ہاتھوں نے کمائی ہوتی ہے۔''

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ. (۲)

''(اے انسان اپنی تربیت یوں کر کہ) جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہ کر) اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے اپنی خرابیٔ نفس کی طرف منسوب کر)۔''

(۱) الشوریٰ، ۴۲:۳۰

(۲) النساء، ۴:۷۹

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے مگر مصیبت کے وقوع میں خالصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے لیکن ادب زندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔ یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

یہ تو انفرادی شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا.(۱)

''بحر و بر میں فساد ان (گناہوں) کے باعث پھیل گیا ہے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کما رکھے ہیں تاکہ (اللہ) انہیں بعض (برے) اعمال کا مزہ چکھا دے جو انہوں نے کیے ہیں۔''

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب و ارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت ربّانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج و عواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ و شر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا کا

(۱) الروم، ۳۰:۴۱

ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟

ایک غلط فہمی اور اس کا جواب

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ انسان سے اگر مواخذہ ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ بقائم ہوش و حواس اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائق تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلاوجہ نہیں پکڑا جاتا بلکہ اس کی گرفت اس کے سبب و اختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ.(۱)

''اگر اللہ چاہتا تو نہ (ہی) ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء و اجداد اور نہ کسی چیز کو (بلا سند) حرام قرار دیتے۔''

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے اور اسی غرض کے لئے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں میں اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہو سکے۔

خدائی فعلِ 'خلق' کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لئے منتخب کرلے۔ اس لئے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسب و ارتکاب کے لئے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

(۱) الأنعام، ۶:۱۴۸

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے: دن کے ساتھ رات، آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے براءت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لئے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہوجانے کے بعد وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے۔ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون یقین کرے گا؟ اُلٹا ہر کوئی اسے ہی کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لئے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلامقصد برہنہ سر یا برہنہ پاؤں چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے۔ اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیسے قصور ثابت ہوا۔

۲۔ اِنسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبور محض۔ تاریخ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مجبور محض ہے اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ جب کہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن وسنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ 'بین القدر والجبر' ہے۔

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتًا اتنا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ہی ایسا مجبور ہے کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بَری قرار دے

سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت 'بین القدر والجبر' ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار و ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

جاء رجل إلى علي، فقال: أخبرني عن القدر، فقال: طريق مظلم لا تسلكه، قال: أخبرني عن القدر، قال: بحر عميق لا تلجه، قال: أخبرني عن القدر، قال: سر الله قد خفي عليك فلا تفتشه، قال: أخبرني عن القدر، قال: يا أيها السائل إن الله خلقك لما شاء أولها شئت، قال: بل لما شاء، قال: فيستعملك كما شاء. (۱)

''ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: مجھے قدر کے بارے میں بتلایئے، آپ نے فرمایا: یہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر مت چلو، اس نے کہا: مجھے قدر کے بارے میں بتلایئے۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہو، اس نے پھر کہا: مجھے قدر کے بارے میں بتلایئے۔ آپ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جو اس نے تم پر مخفی رکھا ہے، پس اس کے بارے میں کھوج نہ لگا، اس نے پھر کہا: مجھے قدر کے بارے میں بتلایئے، آپ نے فرمایا: اے سائل! مجھے یہ بتاؤ! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی منشا سے پیدا کیا ہے یا تمہاری منشا سے؟ اس نے کہا: بلکہ اس نے اپنی منشا سے پیدا کیا ہے۔

(۱) ۱۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ۱: ۱۸۲
۲۔ ہندی، کنز العمال، ۱: ۱۸۱، رقم: ۱۵۶۱

آپ نے فرمایا: پس وہ تم سے اسی طرح کام لے گا جس طرح وہ چاہتا ہے۔''

بین القدر و الجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصور کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

(۱) فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش کے مکش پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس کا فرض اور اس کی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے اُن کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں، تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابل مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعلِ ناحق کے لئے حرکت کریں تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہرحال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکمِ نہی کا بھی خیال آ گیا۔ نتیجتاً دونوں خیالات اُبھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اسی لئے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو 'کشمکش کا مرحلہ' کہا گیا ہے۔

(۲) غور وخوض کا مرحلہ

اس کے بعد غور وخوض کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خدائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی، اس طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غوروخوض کے مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے۔ کشمکش اور غور وخوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اور پابندی (coersion & compulsion) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

(۳) انتخابِ نیت کا مرحلہ

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور پوری سوچ و بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہش نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو 'انتخابِ نیت' کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے۔ آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر بتایے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور وخوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا؟ ہرگز نہیں، یہ تو خالصتاً ذہنی، قلبی اور داخلی عمل تھا۔ ایک کشمکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ و بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

(۴) عزم و ارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ذہنی طور پر کمربستہ ہو جاتے

ہیں۔ یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیش نظر رہے کہ نیت ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہوجانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے۔ نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ مؤخر، لہٰذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

(۵) تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اٹھاتا ہے، عملی تدبیر کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے۔ اگر بالفرض آپ نے کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کرلیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہو گا، لہٰذا ثابت ہوا کہ تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

(٦) نتیجۂ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تعمیل ہو چکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مرجائے یا زخمی ہو جائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلہ تعمیل کے تابع ہے، جبکہ مرحلہ تعمیل خود عزم وارادے کے تابع ہے اور انتخاب نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیوں کہ وہ محض غور وخوض کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا تھا۔

یہ چھ مراحل ہیں جن سے گزر کر کوئی عمل اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے اب بتایئے کہ ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کشمکش سے لے کر نتیجہ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے اسی اقدام کا نام 'کسبِ عمل' ہے۔

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہوکر انتخاب نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہوکر

نتیجہ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخاب نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.(۱)

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔''

مزید فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ.(۲)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں (یعنی نیتوں) اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''

گویا اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی جزائے عمل ہوگی۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ.(۳)

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب بدء الوحي، ۱: ۳، رقم: ۱

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله، ۴: ۱۹۸۶، رقم: ۲۵۶۴
۲۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب القناعة، ۲: ۱۳۸۸، رقم: ۴۱۴۳
۳۔ ابن حبان، الصحیح، ۲: ۱۱۹، رقم: ۳۹۴

(۳) النساء، ۴: ۱۰۰

’’اور جو شخص بھی اپنے گھر سے اﷲ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے پھر اسے (راستے میں ہی) موت آ پکڑے تو اس کا اجر اﷲ کے ذمے ثابت ہو گیا۔‘‘

کیوں کہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں، بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتسابِ عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے، حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لئے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور بااختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ شخص ’بااختیار‘ تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بقیہ تمام مراحلِ عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے (یعنی چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ عزم و ارادہ اصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادہ نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل ’جبر و اکراہ‘ کہلاتا ہے اور جبر و اکراہ حالتِ اِضطرار (extreme necessity) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی و

قانونی ذمہ داری اور جواب دہی مرتفع ہوجاتی ہے۔ خدا کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ لہٰذا یہ حالت 'استثنیٰ (exception)' کی ہوگئی مگر اصول وکلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخابِ نیت کے باعث پابندِ جزا وسزا ہے۔

اس موضوع پر عقائد اسلامی کی کتاب 'شرح العقائد النسفیۃ' میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں۔ علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں:

وللعباد أفعال اختياريةٌ يُثابونَ بها إن كانت طاعة ويعاقبون عليها إن كانت معصية لا كما زعمت الجبرية أنه لا فعل للعبد أصلا وأن حركاته بمنزلة حركات الجمادات لا قدرَة عليها و لا قصد ولا اختيار وهذا باطل لأنا نفرق بالضرورة بين حركة البطش وحركة الِارتعاش ونعلم أن الأول باختياره دون الثاني ولأنه لو لم يكن للعبد فعل أصلا لما صحَّ تكليفهُ، ولا يترتبُ استحقاق الثواب والعقاب على أفعاله ولا إسناد الأفعال التي تقتضى سابقية القصد والاختيار إليه على سبيل الحقيقة مثل صلى و كتب وصام بخلاف مثل طال الغلام واسودَّ لونُه. إن الله خالق والعبد كاسب وتحقيقه أن صرف العبد قدرته وإرادته إلى الفعل كسب وإيجاد الله تعالى الفعل عقيب ذالك خلق والمقدور الواحد داخل تحت القدرتين لكن بجهتين مختلفتين فالفعل مقدور الله تعالى بجهة الإيجاد ومقدور العبد بجهة الكسب كالأرض تكون ملكا لله تعالى بجهة التخليق وللعباد بجهة ثبوت التصرّف.[1]

(۱) ۱۔ تفتازانی، شرح العقائد النسفیۃ، ۱: ۸۱-۸۴
۲۔ سفارینی، لوامع الأنوار البہیۃ، ۱: ۲۹۲

’’اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت پر مبنی ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں۔ اس کی حرکات وسکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں، جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، یہ باطل ہے، کیوں کہ ہم پکڑنے اور کانپنے کی حرکت میں ضرور فرق کرتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلی حرکت بندے کے اختیار سے ہے نہ کہ دوسری حرکت، اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا احکام الٰہی کا مکلّف ٹھہرایا جانا اور اس کا ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ان افعال میں حرکت سے پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا، لڑکا بڑا ہو گیا، یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ ان افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے لہٰذا یہ کسب ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے، یہ خلق ہے ایک ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوت تصّرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔‘‘

علامہ تفتازانیؒ کی مذکورہ بالا بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ

اگرچہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے فعلِ خَلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے، لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

باب دوم

جبر و قدر اور تصوّرِ عدل

اِنسان کے مجبور یا مختار ہونے نیز انسان کے 'اپنے افعال کے کاسب ہونے' پر گزشتہ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے مگر خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسب اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌo [1]

''تم جو چاہو کرو، بے شک جو کام تم کرتے ہو وہ خوب دیکھنے والا ہے o''

اس آیت مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

ا۔ 'اِعْمَلُوْا (تم عمل کرو)' کے لفظ میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے، وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا برے عمل کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے احتراز کرے، اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ 'مَا شِئْتُمْ (تم جو چاہو)' سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے جبکہ 'مَاشِئْتُمْ'

---

(۱) حم السجدة، ۴۱: ۴۰

سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی رَوِش چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ وہ نہ سوچ میں پابند و مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ اِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال کو ذات باری دیکھ رہی ہے، تاکہ اسے جزا و سزا بھی دی جا سکے۔ اگرچہ اسے نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خودمختاری دی گئی ہے مگر اس آزادی کے عطا کئے جانے کا مقصد اسے شُترِ بے مہار کر دینا نہیں بلکہ اسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا اور اسے اپنی صوابدید کے مطابق کئے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جوابدہ ہونا ہوگا۔ قرآن حکیم کے مطالعے کی روشنی میں انسان کو آزادی دیے جانے کے جو مقاصد بیان کئے جاسکتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل

اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اپنے کارخانہ قدرت کو قانونِ عدل پر ہی قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں چنانچہ سورۂ المائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۨ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.(۱)

''اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو (کہ) وہ پرہیزگاری سے نزدیک تر

(۱) المائدۃ، ۵: ۸

ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ.(۱)

’’اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔‘‘

عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

العدل ما قام في النفوس أنه مستقيم وهو ضد الجور.(۲)

’’عدل سے مراد یہ ہے کہ جو چیز دلوں میں راسخ ہو جائے کہ یہ صحیح ہے اور وہ ظلم کی ضد ہے۔‘‘

دوسرے لفظوں میں حقدار کو اُس کا حق دینا، مستحق کو اس کا جائز مقام دینا عدل ہے جبکہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریبی عزیز کا ہو یا اپنے والدین سے متعلق ہو۔

چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ‌ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا.(۳)

’’اے ایمان والو! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ

(۱) النساء، ۴: ۵۸
(۲) ابن منظور، لسان العرب، ۱۱: ۴۳۰
(۳) النساء، ۴: ۱۳۵

کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ (گواہی) خود تمہارے اپنے یا (تمہارے) والدین یا (تمہارے) رشتہ داروں کے ہی خلاف ہو اگرچہ (جس کے خلاف گواہی ہو) مالدار ہے یا محتاج، اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سوتم خواہش نفس کی پیروی نہ کیا کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ۔‘‘

اللہ رب العزت نے ایک دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی.(۱)

’’بے شک اللہ (ہر ایک کے ساتھ) عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے اور قرابت داروں کو دیتے رہنے کا۔‘‘

(ا) عدل کا مقام رفیع ...... اِحسان

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے، جب کہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسن جود و فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کئے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ اور نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا گئے یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو گیا تو انسان درجہ ظلم پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے نیکی اور تقویٰ کے نقطۂ نظر سے ایک بلند تر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) النحل، ۱۶:۹۰

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَo[۱]

’’بے شک اللہ نیکوکاروں سے محبت فرماتا ہےo‘‘

یہ ’مقامِ احسان‘ ہے اس لئے فرمایا: کہ اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز رہو۔ حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقام احسان سے اترنا بھی چاہو تو مقام عدل پر تو فائز رہ سکو۔

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال میں نظام عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے مطالبہ یہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے تو عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق فیصلہ کرو۔ وہ ذات جب خود مسندِ عدل پر متمکن ہوگی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر پیکرِ عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں باربار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانبیاء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا.[۲]

’’اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کے ترازو رکھ دیں گے سو کسی جان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا (تو) ہم اسے (بھی) حاضر کر دیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَo[۳]

(۱) البقرة، ۲: ۱۹۵
(۲) الأنبياء، ۲۱:۴۷
(۳) آل عمران، ۳: ۲۵

''اور جس جان نے جو کچھ بھی (اعمال میں سے) کمایا ہوگا اسے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گاo''

ایک دوسرے مقام پر 'روزِ محشر' کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکوکاروں کو دائیں ہاتھ میں۔ اس موقع پر ارشاد ہوگا:

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ o(۱)

''یہ تیرے ان اعمال کے باعث ہے جو تیرے ہاتھ آگے بھیج چکے تھے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہےo''

(۲) اللہ تعالیٰ کی اِحسان پسندی

یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کی بجائے جہاں تک ہو سکے گا لطف و کرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَo(۲)

''جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں اور جو کوئی ایک گناہ لائے گا تو اس کو اس جیسے ایک (گناہ) کے سوا سزا نہیں دی جائے گی اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گےo''

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى

(۱) الحج، ۲۲:۱۰

(۲) الأنعام، ۶:۱۶۰

الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ (۱)

''جو شخص نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو برے کام کرنے والوں کو کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی قدر جو وہ کرتے رہے تھے۝''

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو، اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بری تقدیر لکھ کر اسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی برائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً. (۲)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

نیز ارشاد فرمایا:

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ۝ (۳)

''پس اگر وہ (تمہیں مجبور کرنا) چاہتا تو یقیناً تم سب کو (پابندِ) ہدایت فرما

(۱) القصص، ۲۸:۸۴

(۲) النحل، ۱۶:۹۳

(۳) الأنعام، ۶:۱۴۹

دیتاo“

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصور بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور ارشاد فرمایا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔ (۱)

”تم جو چاہو کرو۔“

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

۲۔ جزا و سزا اور نظامِ عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔ اسی سے نظام عدل کے ساتھ جزا وسزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَo (۲)

”بس تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو کرتے رہے تھےo“

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت نے اسکی وضاحت یوں فرمائی:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىo (۳)

”اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو

(۱) حم السجدة، ۴۱: ۴۰
(۲) التحریم، ۶۶: ۷
(۳) النجم، ۵۳: ۳۹

گی (رہا فضل اس پر کسی کا حق نہیں وہ محض اللہ کی عطا و رضا ہے جس پر جتنا چاہے کر دے)o‘‘

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ.(۱)

’’اس نے جو نیکی کمائی اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس نے جو گناہ کمایا اس پر اس کا عذاب ہے۔‘‘

(۱) جزا و سزا اور اِتمام حجت

جزا و سزا کے لئے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًاo(۲)

’’اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم (اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج لیںo‘‘

اس سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى.(۳)

’’اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بارِ (گناہ) نہ اٹھا سکے گا۔‘‘

اسی طرح قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہو گا۔ چنانچہ سورۂ عبس

(۱) البقرة، ۲: ۲۸۶
(۲) بني إسرائيل، ۱۷: ۱۵
(۳) فاطر، ۳۵: ۱۸

میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ○ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ○ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ○[1]

''اُس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا○ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (بھی)○ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے (بھی)○ اس دن ہر شخص کو ایسی (پریشان کن) حالت لاحق ہو گی جو اسے (ہر دوسرے سے) بے پروا کر دے گی○''

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور مقربین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ المعارج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ م بِبَنِيْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ○ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْيْهِ○ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ○[2]

''مجرم آرزو کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب (سے رہائی) کے بدلہ میں اپنے بیٹے دے دے○ اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی (دے ڈالے)○ اور اپنا (تمام) خاندان جو اُسے پناہ دیتا تھا○ اور جتنے لوگ بھی زمین میں ہیں، سب کے سب (اپنی ذات کے لیے بدلہ کر دے)، پھر یہ (فدیہ) اُسے (اللہ کے عذاب سے) بچالے○''

البتہ نیکو کار اور پرہیز گار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لئے فرمایا:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ م بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ○[3]

(۱) عبس، ۸۰: ۳۴-۳۷
(۲) المعارج، ۷۰: ۱۱-۱۴
(۳) الزخرف، ۴۳: ۶۷

’’سارے دوست و احباب اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے (انہی کی دوستی اور ولایت کام آئے گی)o ‘‘

بالفاظ دیگر اس روز سب لوگ پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے اس دن بھی اپنےبجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے اور اپنے اپنے درجے اور رتبے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے منصب شفاعت پر سرفراز ہوں گے، مگر ان کی شفاعت شفاعتِ صغریٰ ہوگی جب کہ سب سے بڑی شفاعت سرورِ کائنات ﷺ کی ہوگی۔

بہرحال جب تک اتمام حجت نہ کر دیا جائے اقوام وملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا o (۱)

’’اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم وہاں کے امراء اور خوشحال لوگوں کو (کوئی) حکم دیتے ہیں (تاکہ ان کے ذریعہ عوام اور غرباء بھی درست ہو جائیں) تو وہ اس (بستی) میں نافرمانی کرتے ہیں پس اس پر ہمارا فرمانِ (عذاب) واجب ہو جاتا ہے پھر ہم اس بستی کو بالکل ہی مسمار کر دیتے ہیںo ‘‘

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ جس بستی اور جس قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کرتا ہے، انہیں اطاعت اور فرمانبرداری کی

(۱) بنی إسرائیل، ۱۷:۱٦

ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے اوراس کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں تو پھر ان پر عذاب خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو قوم خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہے، اللہ تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اللہ رب العزت نے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ.(۱)

’’بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔‘‘

(۲) اِتمامِ حجت کا مفہوم

اتمام حجت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام وعواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ.(۲)

’’(اس لئے بھیجے گئے) تاکہ (ان) پیغمبروں (کے آ جانے) کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔‘‘

ذات خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے

(۱) الرعد، ۱۳: ۱۱

(۲) النساء، ۴: ۱٦۵

سے پہلے اس کو باربار فہمائش کرتی ہے۔محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔اس ذات کا ارشاد گرامی ہے کہ:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۝(۱)

''اور ہم ان کو یقیناً (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے قریب تر (دنیوی) عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے تاکہ وہ (کفر سے) باز آ جائیں۝''

اس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بےبس بنا دیا ہے۔

۳۔ اَخلاقی جد و جہد

اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصور اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔چنانچہ سورۂ ملک میں ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا(۲)

''جس نے موت اور زندگی کو (اِس لیے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے، اور وہ غالب ہے بڑا بخشنے والا ہے۔''

یعنی اچھے اور برے عمل جانچنے کے لئے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا، ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۝(۳)

---

(۱) السجدة، ۳۲: ۲۱

(۲) الملك، ۶۷: ۲

(۳) التين، ۹۵: ۴-۶

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہےo پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیاo سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا (دائمی) اجر ہےo''

ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاo قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاo وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاo(۱)

''اور انسانی جان کی قَسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قَسم o پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دیo بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)o اور بے شک وہ شخص نامراد ہوگیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)o''

ایک اور مقام پر اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَo(۲)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کما رکھی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے (کہ) اُن کی زندگی اور ان کی موت برابر ہو جائے۔ جو دعویٰ (یہ کفّار) کر

(۱) الشمس، ۹۱: ۷-۱۰

(۲) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۱

رہے ہیں نہایت برا ہےo‘‘

ان تمام آیات مبارکہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اخلاقی جدوجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خود مختار گمان کیا جائے اور اللہ تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی۔ تو اس کے ہاتھ بندھے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے ایسی نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ مجبور آدمی کی تو نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے، تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگزر کو اہمیت دے سکتی ہے؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو 'اضطرار' تو کہہ سکتے ہیں نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمان نبوی کے مطابق تخلیق کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ:

إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي.(۱)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، باب وکان عرشه علی الماء، ۶:۲۷۰۰، رقم: ۶۹۸۶

۲۔ ابن ماجه، السنن، فضل بن عباس، باب فیما أنکرت الجهمیة، ۱: ۶۷، رقم: ۱۸۹

’’میری رحمت میرے غضب پر مقدم ہے۔‘‘

کیونکر اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و مجبوری سے غلط فائدہ اٹھائے گا۔

۴۔ حالت اِضطرار اور قانونِ اِسلامی

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حالت اضطرار میں شریعت اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اٹھا لیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے مردار اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○(۱)

’’اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے○‘‘

اللہ تعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالت اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ.(۲)

’’حالانکہ اس نے تمہارے لیے ان (تمام) چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جو

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۷۳

(۲) الأنعام، ۶: ۱۱۹

اس نے تم پر حرام کی ہیں، سوائے اس (صورت) کے کہ تم (محض جان بچانے کے لیے) ان (کے بقدرِ حاجت کھانے) کی طرف انتہائی مجبور ہو جاؤ (سو اب تم اپنی طرف سے اور چیزوں کو مزید حرام نہ ٹھہرایا کرو)۔‘‘

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌo(۱)

’’پھر اگر کوئی شخص بھوک (اور پیاس) کی شدت میں اضطراری (یعنی انتہائی مجبوری کی) حالت کو پہنچ جائے (اس شرط کے ساتھ) کہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو (یعنی حرام چیز گناہ کی رغبت کے باعث نہ کھائے) تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے o‘‘

انہی وجوہات و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ الحج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ.(۲)

’’اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔‘‘

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا.(۳)

’’اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔‘‘

(۱) المائدة، ۵: ۳
(۲) الحج، ۲۲:۷۸
(۳) البقرة، ۲: ۲۸۶

اور حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ.(۱)

''مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔''

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ.(۲)

''اور اُن سے اُن کے بارِگراں اور طوقِ (قیود) - جو اُن پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے - ساقط فرماتے (اور انہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں۔''

یہ 'اغلال' اور 'اصر' کیا ہے؟ یہ غلط عقائد اور تصورات کی زنجریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا۔ اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہے:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○(۳)

''اور آپ کیا سمجھے ہیں کہ وہ (دینِ حق کے مجاہدہ کی) گھاٹی کیا ہے○ وہ (غلامی و محکومی کی زندگی سے) کسی گردن کا آزاد کرانا ہے○''

بہر حال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی، اس کے لئے سہولتوں کا اعلان کیا، جن میں سے ایک حالت اضطرار اور حالت اختیار کا

(۱) ۱۔ أحمد، المسند، ۵: ۲۶۶، رقم: ۲۲۳۴۵

۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۸: ۲۲، رقم: ۷۸۸۳

(۲) الأعراف، ۷: ۱۵۷

(۳) البلد، ۹۰: ۱۲-۱۳

نمایاں فرق بھی ہے۔

(۱) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان

خلافت فاروقی کے زمانے میں حجاز مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہو گیا اس حالت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا اور فرمایا: جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریات زندگی مہیا نہیں کر سکتی وہ قطع ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔(۱)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ اصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنت اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں، بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے۔

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکت اسلامیہ میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باوجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

(۲) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد کا ایک اور مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔ صورت حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم

(۱) أبو یوسف، کتاب الخراج، ۱: ۱۴

میں طلب کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہو گئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ آپ نے ان سرداروں کو پیغام بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا کہ تم نے کتنی مدت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتہ چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اونٹوں کی دو گنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔[1]

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالت اختیار میں نمایاں طور پر فرق کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالت اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لئے بھی جبر و اکراہ گوارا نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.[2]

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالت اختیاری کو حالت اضطراری سے ممیّز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کیساتھ بھی حالت مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ۱۔ مالك، الموطأ، ۲: ۷۴۸، رقم: ۱۴۳۶
۲۔ شافعي، المسند، ۱: ۲۲۴
(۲) البقرة، ۲: ۲۵۶

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا.(۱)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔''

(۳) ایک صحابی کا سوال اور حضور ﷺ کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

أفي كل عام، يا رسول الله؟

''یا رسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے؟''

آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس نے سوال دہرایا مگر آپ ﷺ پھر خاموش رہے، اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا تو آپ ﷺ پھر بھی خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوق سوال دیکھا تو فرمایا:

لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ، لَوَجَبَتْ. وَلَمَّا اسْتَطَعْتُمْ. ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَاتَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ. (۲)

''اگر میں ہاں کر دوں تو تم پر ہر سال حج واجب ہو جائے جو ظاہر ہے تمہاری

(۱) آل عمران، ۳: ۹۷

(۲) ۱۔مسلم، الصحيح، كتاب الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ۲: ۹۷۵، رقم: ۱۳۳۷

۲۔ ابن ماجه، السنن، باب اتباع سنة رسول الله، ۱: ۳، رقم: ۲

۳۔ بيهقي، السنن، باب وجوب الحج مرة واحدة، ۴: ۳۲۵، رقم: ۸۳۹۸

استطاعت سے باہر ہے پھر فرمایا: جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو کیوں کہ تم میں سے پہلی اُمتیں کثرتِ سوال کے باعث ہلاک ہوئی ہیں۔‘‘

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ انسان کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لئے آیا ہے۔ یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے کے لیے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اتارنے اور اختیار و اضطرار میں فرق کرنے والا دین ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت ومحبت اور شفقت و احسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اِختیارات اُمورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

بابِ سوم

قضا و قدر کا اِنسانی زندگی میں کردار

انسان کے مجبور یا مختار ہونے اور اپنے اعمال کے کاسب ہونے کے مسائل پر بحث مکمل کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اصل میں مسئلہ تقدیر کیا ہے؟ اور قضا و قدر میں باہمی فرق کیا ہے؟

ا۔ قدر کا مفہوم

'قدر' کا لغوی مفہوم 'اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا اور مقرر کرنا' ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ○(۱)

''اور ہر چیز کو ہم نے روشن کتاب (لوحِ محفوظ) میں احاطہ کر رکھا ہے○''

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ○(۲)

''بلکہ یہ بڑی عظمت والا قرآن ہے○ (جو) لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے○''

نیز ارشاد فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ○(۳)

''اللہ جس (لکھے ہوئے) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) ثبت

---

(۱) یٰسین، ۳۶:۱۲

(۲) البروج، ۸۵: ۲۱-۲۲

(۳) الرعد، ۱۳:۳۹

فرما دیتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب (لوحِ محفوظ) ہےo‘‘

(لوح محفوظ یا ام الکتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جس میں سب چیزوں کے احوال موجود ہوں۔) ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ازل سے موجود ہے، جسے اس نے ’ام الکتاب‘ یا ’لوح محفوظ‘ میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے۔ اور ’کل شیء‘ کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی اس کلیے سے ماوراء نہیں۔

بہت سی احادیث میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ. قَالَ: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ.(۱)

’’اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔‘‘

ایک دوسری روایت میں ہے:

إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ: أُكْتُبْ فَقَالَ مَا أُكْتُبُ؟ قَالَ أُكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ.(۲)

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء، ۶: ۲۶۹۹، رقم: ۶۹۸۲

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسی علیهما السلام، ۴: ۲۰۴۴، رقم: ۲۶۵۳

(۲) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب القدر، باب ماجاء في الرضا بالقضاء، ۴: ۴۵۷، رقم: ۲۱۵۵

۲۔ مقدسی، الأحادیث المختارة، ۸: ۳۵۲، رقم: ۴۲۹

’’سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو تخلیق فرمایا اور اسے حکم دیا کہ لکھ۔ اسنے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا: مخلوقات کی تقدیریں لکھو چنانچہ اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز ہونے والی تھی سب لکھ دیں۔‘‘

اسی طرح ایک موقع پر بعض صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے بوجوہ ترک لذات کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ.(۱)

’’تجھے جو کچھ ملنا ہے اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔‘‘

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں جن سے مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایات مختلف محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ لہٰذا ان روایات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

عوام الناس کی غلط فہمی کا ازالہ

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام الناس میں لیا جاتا ہے وہ قرآن و حدیث کی مراد کے قطعاً منافی بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان آثار و روایت سے یہ تاثر لیا ہے کہ مسئلہ تقدیر کا مفہوم نوشتہ تقدیر کے سامنے تمام مخلوق بالخصوص انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں مسئلہ تقدیر کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور اور مقید کر دیا ہے وہ اس سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من التبتل والخصاء، ۵: ۱۹۵۳، رقم: ۴۷۸۸
۲۔ نسائی، السنن، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل، ۳: ۲۶۴، رقم: ۵۳۲۳

۲۔ قضاء وقدر کی دو اِصطلاحیں اور ان کا مفہوم

ان دو مختلف اسلامی اصطلاحات میں خلط مبحث کے نتیجے میں عوام الناس اس مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں اصطلاحوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بڑی حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

قضا و قدر کے دو مفہوم ہیں، ان میں سے ایک آفاقی اور کائناتی سطح کے اعتبار سے اور دوسرا انسان کے شخصی و انفرادی احوال کے اعتبار سے ہے۔

(۱) قضا و قدر آفاقی و کائناتی اِعتبار سے

آفاقی اور کائناتی اعتبار سے قضا وقدر کا مفہوم یہ ہے کہ قضا کا مفہوم تخلیق اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں، زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کئے اوران میں موجود لطیف و کثیف مخلوق کی تخلیق فرمائی، یہ اللہ تعالیٰ کی قضا ہے۔ اسی بنا پر سورۂ حم السجدۃ میں ارشاد فرمایا گیا:

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا.[1]

''پھر دو دِنوں (یعنی دو مرحلوں) میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر سماوی کائنات میں اس کا نظام ودیعت کر دیا۔''

یہاں قضا کا لفظ خَلق یعنی پیدائش کے معنوں میں مستعمل ہے، جبکہ قدر قدرت اور تقدیر وقدیر کے الفاظ جو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں ان کا مفہوم 'اختیار' و 'اِختبار (چننا)' ہے۔اس طرح 'قضا وقدر' کے دو لفظوں میں تخلیق کائنات اور اس کی بقا و سالمیت کا راز پنہاں ہے۔ ان دو الفاظ میں قانون تخلیق کی وہ بنیادی شق بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر قدرت کا یہ عظیم اور پُر ہیبت کارخانہ تخلیق کیا گیا اور اس کے ایک ایک ذرّے کو ادراک وشعور بخشا گیا ہے۔

(۱) حم السجدۃ، ۴۱: ۱۲

(۲) اِنسانی زندگی میں قدر کا مفہوم

انسان کی انفرادی اور شخصی سطح پر قدر کے معنی 'اندازہ' اور قضا کے معنی 'اِجراء' کے ہیں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لئے اچھائی اور برائی تخلیق کرکے اسے اس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور اپنے عمل کے لئے مخصوص کر لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا وطیرہ بنا لے۔ چنانچہ سورۃ البلد میں ارشاد فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِO وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِO وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِO[2]

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ اور (اسے) ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)۔ اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیے۔''

بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہ خیر میں صرف کر کے مراتب کمال سے ہمکنار ہو جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے بیج بونے اور کاٹنے کے لئے وقف کردے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.[3]

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔''

---

(۱) اصفہانی، المفردات، ۱:۴۰۷
(۲) البلد، ۹۰:۸-۱۰
(۳) البقرة، ۲: ۲۵۶

نیز ارشاد فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ.(۱)

''اور فرما دیجیے کہ (یہ) حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔''

اللہ رب العزت نے سرورِ کائنات ﷺ کو اپنے دین کی تبلیغ کے بارے میں تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ.(۲)

''رسول (ﷺ) پر (احکام کاملاً) پہنچا دینے کے سوا (کوئی اور ذمہ داری) نہیں۔''

انبیاء کرام علیھم السلام بھی اپنی اپنی قوموں کو تذکیر و موعظت کے بعد فرماتے تھے:

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُo(۳)

''اور واضح طور پر پیغام پہنچا دینے کے سوا ہم پر کچھ لازم نہیں ہےo''

مقصد یہ تھا کہ پیغمبروں کا کام ایصال الی المطلوب نہیں بلکہ محض خدا کے پیغام کا پہنچانا تھا۔ حکم الٰہی پہنچ جانے کے بعد اب یہ کام متعلقہ فرد کا ہے کہ وہ چاہے تو نبی کی باتوں پر کان دھرے یا چاہے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اسی بنا پر سورۃ الکافرون میں اتمام حجت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(۱) الکہف، ۱۸: ۲۹

(۲) المائدۃ، ۵: ۹۹

(۳) یٰسین، ۳۶: ۱۷

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝ (۱)

’’(سو) تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے ہے۔‘‘

قضا کا مفہوم

’قدر‘ کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی۔ قضا سے مراد وہ اصول اور وہ قوانین فطرت ہیں جن کے تحت یہ کارخانۂ قدرت اپنے اپنے وقت پر اپنے مخصوص خصائص و مصالح کے ساتھ معرض تخلیق میں لایا گیا ہے اور جن کے تحت اس کائنات کے نظام کی بقا کو علت و معلول، سبب اور مسبب نیز عمل اور ردّعمل کے نظام کے تحت منضبط کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرے گا تو اس کے نتائج بھی نیک نکلیں گے اور برائی کے ثمرات بھی ویسے ہی برے ہوں گے۔ انسان جو کچھ کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ جس مقصد کے لئے تگ و دو اور جدوجہد کرے گا اس کے حصول میں کامیاب و کامران ہو گا۔ اس تمام نظام قدرت کا نام قضائے الٰہی ہے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں یوں کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝ (۲)

’’بے شک جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کے لیے برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ۝‘‘

بالفاظ دیگر جس شخص نے ہدایت کے آفتاب عالم تاب کی تمام تر جگمگاہٹوں کے باوجود کفر کے اندھیرے اور پُرخطر راستے ہی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اس کے ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہدایت سے محروم رہنا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کی قلبی حالت کی

(۱) الکافرون، ۱۰۹:۶

(۲) البقرۃ، ۲: ۶

ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

كَلَّا بَلْ سكته رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○(۱)

''(ایسا) ہرگز نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان اعمالِ (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے (اس لیے آیتیں ان کے دل پر اثر نہیں کرتیں)۔''

اس مقام ضلالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا ایک نکتہ ثبت ہو جاتا ہے اور اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل بقُعہ نور بن جاتا ہے۔ پھر اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کر لے تو وہ نکتہ محو ہو جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کر لے پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدلے اس کے دل پر ایک ایک نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح ظلمت کدہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس میں قبول حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا ذکر سورۃ المطففین (کی آیت نمبر ۱۴) میں کیا گیا ہے۔(۲)

یہاں پہنچ کر بندے میں قبول حق کا جذبہ مکمل طور پر مر جاتا ہے اور وہ مجسمۂ شیطنت اور سرچشمہ شر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے دل کا تاریک کر دیا جانا نیز ان کے قلوب و اذہان پر مہر خداوندی کا ثبت ہو جانا ان پر کوئی ظلم ہے۔ اصل میں کہ یہ خود ان کے اپنے اعمال و کسب کا نتیجہ اور ثمرہ ہے نیز اُن کے اپنے

(۱) المطففین، ۸۳:۱۴

(۲) طبری، جامع البیان، ۳۰:۹۰

افعالِ شنیعہ کا ردعمل ہے۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا اس کا انجام انہیں دکھا دیا گیا۔

حق کی پکار جاری رہتی ہے

(اصول قضا کے تحت) یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے، مگر قانونِ قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے مسخ شدہ قلوب و اذہان کو مائل بہ حق کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے۔ مزید برآں ان پر توبہ واستغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکمِ قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ پر ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں) کا حکم نازل ہونے اور کفار و معاندین کے قلوب کے مسخ شدہ ہونے کی خبر زبانِ رسالت سے نشر کئے جانے کے باوجود بھی پیغمبر اسلام کی طرف سے ان کو ہدایت وتبلیغ جاری رہی اور ان کی ہلاکت سے پہلے کسی موقع پر بھی یہ فیصلہ نہیں کرلیا گیا کہ اب پیغام ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ (۱)

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کرکے اور خراب اور ناقص غذائیں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کرلے۔ جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کرانے کے بجائے از خود مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کردے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذائیں اس شخص کو مزید بیمار اور مضمحل کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب اگر مذکورہ شخص یہ شکایت کرنے بیٹھ جائے کہ لوگ یہی

(۱) البقرة، ۲: ۶

غذائیں کھاتے ہیں اور طاقت ور ہوجاتے ہیں اور میں روز بروز مزید کمزور ہوتا جا رہا ہوں تو ایسے شخص کو ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا کہ اس میں نہ کسی دوسرے کا قصور ہے نہ غذا کا۔ یہ تو اس کا اپنا قصور ہے کہ اس نے پہلے اپنا معدہ خراب کیا پھر اسی کیفیت میں مرغن غذائیں کھانی شروع کر دیں۔

اسی طرح ایک شخص برائی کی زندگی اختیار کرتا ہے پھر اس راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر قلب کے متعفن اور مردہ ہوجانے کی وجہ سے اس میں قبول حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس سوچ کا کوئی جواز ہے کہ 'میرا مقدر ہی خراب تھا'۔ اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے جس بگاڑ کے ہوتے ہوئے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے اور پھر وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دے۔

قدر مقدم ...... قضا مؤخر

انفرادی اور شخصی سطح پر قضا و قدر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے اول الذکر یعنی 'قدر' کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی 'قضا' کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ مقدم اور قضا ہمیشہ مؤخر ہوتی ہے۔

لفظی اعتبار سے قدر کے معنی اندازہ کرنا یا کسی چیز کو ماپنا اور تولنا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے evaluation اور assessment وغیرہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰـهُ بِقَدَرٍo[1]

(۱) القمر، ۵۴:۴۹

’’بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک مقرّرہ اندازے کے مطابق بنایا ہےo‘‘

اردو میں ’قدر‘ کا لفظ اندازے کے لئے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ ’یہ چیز اس قدر کافی ہے‘ یا ہم یہ کہتے ہیں کہ ’یہ بات اس قدر درست ہے اور اس قدر غلط‘ پس قدر سے مراد اردو میں ایک خاص اندازہ اور مقدار ہوتی ہے جبکہ قضا کا معنی اظہار اور بیان ہے۔

قدرت نے اپنے عالم الغیب و الشہادۃ ہونے کی بنا پر تخلیق کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر مبنی علم کے اظہار کا نام قضا ہے۔ جیسے کوئی انتہائی قابل اور تجربہ کار استاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک کے متعلق کہہ دے کہ فلاں طالب علم ضرور فیل ہو گا اور ایک سال کے بعد وہ طالب علم فیل ہو جائے تو کیا استاد کا ایک سال پہلے اس کے فیل ہونے کی پیشن گوئی کرنا اس کے فیل ہونے کا باعث ہوا یا اس کا اپنا عمل؟ ظاہر ہے کہ استاد کا اعلان بچے کے مستقبل کو متاثر نہیں کر سکتا۔ استاد کے اس قول نے مذکورہ طالب علم کے فیل ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ امر واقعہ ہے کہ وہ محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ دن دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ البتہ استاد کا ایک سال قبل بتا دینا اس کے کمال علمی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے۔

موسمی حالات کی پیشین گوئی

اسی طرح محکمہ موسمیات کی طرف سے روزانہ موسمی حالات کی پیشن گوئی کی جاتی ہے جس میں کسی علاقے میں بارش کا ہونا اور کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر پیشین گوئی کے بعد اگلے روز بارش ہو جاتی ہے یا موسم خشک رہتا ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ بارش برسانے میں محکمہ موسمیات کا دخل ہے اور نہ موسم کی خشکی میں۔ یہ محض حالات سابقہ کے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفروضہ

معلومات کا اظہار تھا۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظام قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ پیشین گوئیاں غلط بھی ثابت ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرین فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور اس کے مطابق چاند اور سورج کو گرہن لگ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ گرہن اس پیشین گوئی کی وجہ سے تو نہیں لگتا بلکہ یہ نظام قدرت کا حصہ ہے۔

پیشین گوئیوں کا پس منظر

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگوں کو وقت سے پہلے آنے والے حوادث و واقعات کا پتا کیونکر چل جاتا ہے؟ وہ کیسے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات کا ہر وجود ایک معین و مقرر سمت کی جانب محوِ سفر ہے۔ اس کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے۔ خالق کائنات نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبب کو مشروط و ملزوم کر دیا ہے۔ تو جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کے علت و معلول یا سبب اور مسبب کو جان جاتے ہیں، ان کے لئے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کا جان لینا دشوار نہیں رہتا۔ اس نوع کی تمام پیشین گوئیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ لوگ واقعات کے خارجی وقوع سے پہلے محض علت یا سبب کو جان کر اس کے معلول یا مسبب کا کھوج لگا لیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوجاتی ہے کہ ماہرین فلکیات ہوں یا ماہرین موسمیات وہ اپنی پیشین گوئی کے ذریعے نظام کائنات کی سمت اور جہت تبدیل نہیں کرتے اور ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ یہ جہت اور سمت تو خلاّق عالم نے ان کو ابتداء آفرینش سے عطا کر رکھی ہے۔ یہ لوگ تو فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں اور بس۔

زمانہ کے تین روپ ہیں: ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی تو ہم پر عیاں ہے کہ اس کے تمام واقعات لوحِ دہر پر مرقوم ہوکر سب کی نگاہوں میں آ چکے۔ایک طرح سے حال بھی ہمارے علم اور ادراک کے دائرے میں ہے۔ البتہ مستقبل زمانے کا وہ حصہ ہے جو مکمل طور پر ہماری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہے اس کی ایک ایک کڑی پردہ غیب میں مستور ہے۔ اسی بنا پر سورۂ لقمان میں مغیباتِ خمسہ (پانچ خفیہ اُمور) میں سے ایک امر یہ بھی ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَاتَکْسِبُ غَدًا. (۱)

''اور کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کل کیا (عمل) کمائے گا۔''

لیکن مستقبل ہر ایک کے لئے مخفی نہیں ہے۔کوئی آنکھ ایسی بھی ہے جس کے سامنے مستقبل کا ہر واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت روز روشن کی طرح ظاہر و بیّن ہے۔ یہ ہستی خود ذات جلّ وعلا کی ہے جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل کھلی کتاب کی طرح روشن ہے۔ اپنے وسیع علم اور غیر محدود ادراک کی بنیاد پر وہ یہ جانتا ہے کہ آئندہ زمانے میں کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا۔اس کی قدرتوں اور قوتوں کی طرح اس کا علم بھی بے پایاں ہے۔لیکن جس طرح کسی واقعے کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا اسی طرح یہ بے پایاں خدائی علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہوسکتا۔ (۲)

(۱) لقمان، ۳۱: ۳۴

(۲) مولانا رومؒ نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کو شاہی پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا کہ اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔کوتوال نے چور سے پوچھا تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا۔ تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرّہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے الٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھایا پیا سب بھول جائے۔ یہ حکم سن کر چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا: اب ـــــ

خدا تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ.(۱)

’’اور غیب کی کُنجیاں (یعنی وہ راستے جن سے غیب کسی پر آشکار کیا جاتا ہے) اسی کے پاس (اس کی قدرت وملکیت میں) ہیں، انہیں اس کے سوا (اَز خود) کوئی نہیں جانتا۔‘‘

’مفاتیح الغیب‘ کہتے ہیں ’مخفی حقائق‘ کو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق مخفیہ غیبیہ کا علم خدا کے پاس ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات آفرینش کائنات سے پہلے موجود تھی۔ اس نے انسانوں اور دوسری کائنات کو پیدا کیا اور پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا

...... کیوں روتا ہے؟ یہ کام میں بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جا گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا۔ ارے او بے حیا! یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا: اگر اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟ خدائے بے نیاز کی لازوال نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے؟ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا: ذرا مضبوط سی رسی اور کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے کو جواب دوں۔ غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی کمر پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چور نے کہا: ارے بھائی! کچھ تو خدا کا خوف کرو مجھے مار ڈالو گے؟ اس نے جواب دیا: چیخو مت، اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔ آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوت اختیار یہ حاصل ہے۔ (حکایات رومی، ۱:۱۷۶)

(۱) الأنعام، ۶: ۵۹

فرما دیا۔ انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور برے کام کئے۔ کسی نے قتل کیا، کسی نے لوٹ مار مچائی، کسی نے بھلائی کی، کسی نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کئے۔ لڑائیاں لڑیں، ملک فتح کئے، زمین کو سنوارا، شہر آباد کئے، چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے سے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ مفاتیح الغیب کا مالک ہے اس لئے انسانوں کو متوقع آزادی دیئے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے وہ اسے پہلے سے معلوم تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا۔

فی الجملہ کسی امر کا پہلے سے جان لینا، اس کے وقوع کا اندازہ لگا لینا 'قدر' ہے اور تخلیق کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جبکہ اس کے علم کے اظہار اور اسے بیان کر دینے کا نام 'قضا' ہے۔ 'قدر' انسانی آزادی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے مختار اور آزاد ہونے پر روشنی پڑتی ہے انسان اور اس کے اعمال و کوائف سے متعلق اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اندازوں کا اظہار ہوتا ہے۔

قضا مُعلَّق ...... اور قضا مُبرم

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گو اللہ تعالیٰ نے انسان کے کسب و عمل کی نسبت پہلے سے اندازہ مقرر فرما لیا ہے اور 'قضا' کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرما دیا ہے لیکن انسان کا تکمیل کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے، اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے اور خدا کی طرف سے بھی یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی بندہ بدلنا چاہے تو ہم اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس کی تقدیر بھی بدل دیں گے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ○[1]

(۱) الرعد، ۱۳: ۳۹

’’اللہ جس (لکھے ہوئے) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) ثبت فرما دیتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب (لوحِ محفوظ) ہےo‘‘

اُم الکتاب سے مراد ’لوح محفوظ‘ ہے۔ جہاں ما کان و ما یکون کے اَحوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے جو بقول بعض علم الٰہی کا نام ہے۔ لہٰذا اس آیہ مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اندازے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں رد و بدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عام طور پر ’قضا معلق‘ کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا انسان خود کو بدل لے یا بدلنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقررہ کردہ تقدیر میں تبدیلی فرما دیتا ہے۔

معاذ اللہ خدا کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط نہیں ہوسکتا تو پھر لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اگر تقدیر لکھی ہوئی نہ ہو تو اس کو لکھنا کیوں ضروری ہوا؟ بہرحال لکھی ہوئی کو مٹانا اور نہ لکھی ہوئی کا لکھا جانا، یہ دونوں امر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع و محل کی نسبت سے تغیر و تبدیل ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وبا کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں جلدی کی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

أَتَفِرُّ مِنَ قَضَاءِ اللهِ؟

’’کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟‘‘

فرمایا:

أَفِرُّ مِنَ قَضَاءِ اللهِ إِلَى قَدَرِ اللهِ.(۱)

’’میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور میں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو میرا بچ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہوگا۔ اس لئے فرمایا کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں خدا کے علم کی طرف جا رہا ہوں؛ کیوں کہ قضا ایک امر الٰہی ہے مگر تقدیر پر انسان کا اختیار ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کا ارشادِ گرامی

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا، حضور نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا:

أَفَلَا نَتَوَكَّلُ؟

’’کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ نہ کر لیں؟‘‘

اس پر رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ.(۲)

---

(۱) اصفہانی، المفردات، ۱: ۴۰۷

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب النکاح، باب مایکرہ من التبتل والخصاء، ۵: ۱۹۵۳، رقم: ۴۷۸۸

۲۔ نسائی، السنن، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل، ۳: ۲۶۴، رقم: ۵۳۲۳

’’جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکے ہیں۔‘‘

آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ خدائی علم اور نوشتۂ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کر دیا بلکہ انسان کو تگ و دو اور سعی و جدوجہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی آزادی دی ہے، اسے عمل کا اختیار دیا ہے، اور کسب خیر کی تلقین فرمائی ہے۔

ابتداء خطبہ میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تھا جس میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے (مَا کَانَ) اور جو کچھ ہونے والا ہے (مَا یَکُوْنُ) سب کچھ لکھ دے۔ یہاں غور فرمایئے صرف زمانہ مستقبل کے کوائف قلم بند کرنے کا حکم نہیں دیا جارہا بلکہ ماضی کے واقعات بھی قلم بند کرنے کا امر فرمایا۔ اب اگر یہ تقدیری نوشتہ اپنے سے پہلے (مَا کَانَ) کے واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو مستقبل کے حالات (مَایَکُوْنُ) کو کیونکر متاثر کرسکتا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک طویل خطبہ دیا جس کے متعلق حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَقَامًا، فَمَا تَرَكَ شَيْئًا يَكُوْنَ فِي مَقَامِهِ ذَالِكَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَثَّهُ، حَفِظَهُ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ. (۱)

’’رسول اکرم ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے آپ نے اپنے وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا سب کا ذکر کیا۔ جس نے یاد رکھا اس کو

(۱) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب إخبار النبی ﷺ فيما يكون إلى قيام الساعة، ۴: ۲۲۱۷، رقم: ۲۸۹۱
۲۔ أبو داود، السنن، کتاب الفتن والملاحم، باب ذکر الفتن دلائلها، ۴: ۹۴، رقم: ۴۲۴

یاد رہ گیا اور جس نے بھلا دیا، وہ بھول گیا۔"

اس قسم کی بہت روایات اور احادیث صحاح ستہ میں مروی ہیں جن میں حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے زمانہ مستقبل کی پیشین گوئیاں اور آئندہ زمانے کے واقعات و حالات کا ٹھیک ٹھیک بیان مذکور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے لوگوں کے جنت مین داخل ہونے تک کے تمام وقائع بیان فرما دیئے تھے۔

آپ نے اس خطبہ میں قیامت تک کے احوال کو بیان فرمایا ازل میں قلم نے بھی کائنات کے جملہ حقائق کو لوح محفوظ پر رقم کیا تھا۔اب اگر حضور اکرم ﷺ کا بیان انسانی زندگی کے لئے جبر نہیں ہے تو نوشتہ تقدیر انسان کو کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی کی ذمہ داری خود اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے تا کہ نیکی کی صورت میں جزا کا اور بدی کی صورت میں سزا کا مستحق ہو سکے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال نے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ترے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

نیز فرمایا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بالِ جبریل)

گویا بندے کے لئے خدا کی طرف سے اعلان ہے کہ:

اے انسان! تو اس کائنات میں تصرف کرنے والی واحد مخلوق تھا، کائنات کا

ایک ایک ذرّہ ہم نے تیری غلامی میں دیا تھا تو اگر میری اطاعت اختیار کئے رہتا تو کائنات کا ہر وجود تیرے سامنے سرنگوں اور سربسجود رہتا۔ اے انسان! تو اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے اس کا مقبول بندہ بننے آیا تھا لیکن تجھے کس نے گمراہ کر دیا؟ تو نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میرے تقدیری فیصلوں نے تجھے مجبور اور پابند بنا دیا ہے؟ تجھے قرآن و حدیث کی صورت میں ٹھیک ٹھیک کھلی اور روشن ہدایات دی گئی تھیں۔ تجھے بتا دیا گیا تھا کہ تو اپنے افعال میں مجبور اور مقید نہیں ہے بلکہ اپنے افعال اور اپنے اعمال پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اسی اختیار کی بنیاد پر تجھے تیری نیکی کا صلہ ملے گا اور برائی کی سزا دی جائے گی لیکن دنیا اور اس کی اندھی ہوس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور تو اپنی خواہش کا غلام بن کر رہ گیا۔ تو اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مسئلہ تقدیر پر ڈالتا رہا۔ قیامت کے روز تیرا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا اور تجھے اپنے کئے کی پوری پوری سزا مل کر رہے گی۔

مآخذ ومراجع

۱۔ **آجری،** ابوبکر محمد بن حسین بن عبداللہ (م ۳۶۰ھ)۔ **کتاب الشریعۃ۔** لاہور، پاکستان: انصار السنۃ المحمدیۃ۔

۲۔ **بخاری،** ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ)۔ **الصحیح۔** بیروت، لبنان+ دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۳۔ **بیہقی،** ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ)۔ **السنن الکبریٰ۔** مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبہ دار الباز، ۱۹۹۴ء۔

۴۔ **ترمذی،** ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰-۲۷۹ھ) ۔**الجامع الصحیح۔** بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۵۔ **حسام الدین ہندی،** علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ **کنز العمال۔** بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء۔

۶۔ **ابن حبان،** ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰-۳۵۴ھ)۔ **الصحیح۔** بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

۷۔ **ابو داؤد،** سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد ازدی سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ)۔ **السنن۔** بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء۔

۸۔ **راغب اصفہانی،** ابو قاسم حسین بن محمد (م۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء)۔ **المفردات۔** دمشق، شام: دار القلم + بیروت، لبنان: الدار الشامیہ، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء۔

۹۔ **سیوطی،** جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر (۸۴۹-۹۱۱ھ)۔ **تاریخ الخلفاء۔** بغداد، عراق: مکتبۃ الشرق الجدید۔

۱۰۔ **شافعی**، ابو عبد اللہ محمد بن ادریس (۱۵۰-۲۰۴ھ)۔ **المسند**۔ بیروت لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۱۱۔ **ضیاء مقدسی**، محمد بن عبد الواحد بن احمد (۵۶۹-۶۴۳ھ)۔ **الاحادیث المختارہ**۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء۔

۱۲۔ **طبرانی**، سلیمان بن احمد (۲۶۰-۳۶۰ھ)۔ **المعجم الکبیر**۔ موصل، عراق: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء۔

۱۳۔ **طبری**، ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴-۳۱۰ھ)۔ **جامع البیان فی تفسیر القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء۔

۱۴۔ **ابن منظور**، محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی قاسم بن حبقہ افریقی (۶۳۰-۷۱۱ھ)۔ **لسان العرب**۔ بیروت، لبنان: دار لاحیاء۔

۱۵۔ **ابن ماجہ**، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹-۲۷۳ھ)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء۔

۱۶۔ **مسلم**، ابو الحسین ابن الحجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری (۲۰۶-۲۶۱ھ)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۱۷۔ **مالک**، ابن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث اصبحی (۹۳-۱۷۹ھ)۔ **الموطا**۔ لاہور، پاکستان: مطبع مجتبائی۔

۱۸۔ **نسفی**، عمر بن محمد نسفی (م ۵۳۷ھ)۔ **العقیدۃ النسفیۃ**۔ بیروت، لبنان: مرکز الخدمات والأبحاث الثقافیہ، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۱۹۔ **نسائی**، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب (۲۱۵-۳۰۳ھ)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء۔

۲۰۔ **ابو یوسف**، یعقوب بن ابراہیم (م ۱۸۲ھ)۔ **کتاب الخراج**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔